انتظار حسین کے ہاں مناظرِ فطرت

غلام فرید حسینی

ABSTRACT:

Intezar Husain is one of the prominent fiction writers of the urdu. He contributed a lot to rich the urdu fiction not only by his different style but by various techniques and subjects. His general emphasis is on ancient indian civilization. While writing a story, he loves to eloborate nature's organs i.e trees, jungle, garden, grass, animals, birds, river etc. In this article, delibrate effort is made to highlight the nature, colors in Intezar's fiction.

برٹرنیڈر سل نے کہا تھا "مجموعی طور پر علم ایک حرکت ثلاثہ ہے۔ اس کی ابتداء حسی ادراک سے ہوتی ہے جس میں صرف معروض کا شعور ہوتا ہے۔ پھر حواس کی تشکیکی تنقید کے ذریعے یہ محض موضوعی بن جاتی ہے۔ بالآخر یہ خود شعوری کی منزل تک پہنچتی ہے جس میں موضوع و معروض مزید جدا نہیں رہتے۔ یوں خود شعوری علم کی معراج ہے۔"(۱(

اردو فکشن نگاروں کے ہاں ہمیں کئی ایسے فنکار دکھائی دیتے ہیں جو مندرجہ بالا تعریف پر پورا اترتے ہیں اور وہ خود شعوری کی منزل پر متمکن ہیں۔ عام طور پر فطرت نگاری کو شاعری کا خاصا سمجھا جاتا ہے جس میں شاعر مناظرِ فطرت کے مرقعے پیش کرتا ہے۔ گل و بلبل سے لیکر باغ و بہار، ستارے، چاند، جنگل بیلے وغیرہ سب فطرت کی بو قلمونیوں کو وہ شعروں میں پیش کر دیتا ہے۔ کہانی کار کا مدعا چونکہ کوئی قصہ یا کہانی ہوتے ہیں اس لیے ان کا استدلال پلاٹ، کردار اور منظر نگاری کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں عموماً شاعر ہی فطرت نگاری کے لیے شہرت حاصل کرتے آئے ہیں مثلاًورڈزورتھ، کیٹس، اقبال، انیس، حفیظ جالندھری وغیرہ البتہ یہ ضرور ہے کہ فکشن میں جب ماحول کی منظر کشی ہوتی ہے تو ضمناً پھر عناصر فطرت کا بیان لازمی ٹھہرتا ہے اردو مثنوی چونکہ منظوم قصہ گوئی تھی لہذا اس میں فطرت کی رنگینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انتظار حسین اردو کے وہ غالباً پہلے جدید فکشن نگار ہیں جن کے ہاں فطرت ارادتاً اپنے تمام تر جلوئوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی یہ خوبی ان کی خود شعوری پر دال ہے۔ ان کی کہانیوں میں فطرت ایسے رواں ہے جیسے کہانی جسم اور فطرت اس کی روح ہے۔ اگر مناظر فطرت مثلاً درخت، پرندے، پہاڑ، جنگل، پگڈنڈیاں، گلیاں، کوچے، بازار، بستیاں وغیرہ اس کی کہانیوں میں سے منہا کر دیے جائیں تو وہ کہانی جامد و ساکت ہو جائے گی۔ اس کی حرکت پذیری رک جائے گی۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اصل میں بات درختوں پر آجائے تو پھر میرے لیے اور سب باتیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔"(۲(

انتظار حسین فطرت کو تہذیب سے جوڑ کر دیکھنے کے قائل ہیں وہ صنعتی انقلاب یا جدیدیت کو تہذیب پر حملہ تصور کرتے ہیں۔ اپنے ناول بستی میں وہ بجلی کے کھمبوں کو اور برقی قمقوں کو مشرقی تہذیب پر وار تصور کرتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ ساتھ بندروں تک سے احتجاج کرواتے

نظر آتے ہیں۔ جب سڑک کی تعمیر ہوتی ہے تو بظاہر تو ترقی کی علامت ہے مگر جب اس کی قیمت درختوں کو کاٹ کر ادا ہوتی ہے تو یوں تہذیب کو ایک زخم لگایا جاتا ہے جو درحقیقت فطرت پر چرکہ ہے۔ وہ درخت جو صدیوں سے سایہ فراہم کر رہا تھا جو مذہبی تقدس (مثلاً پیپل، املی وغیرہ) کا بھی حامل تھا، جس کے اندر نجانے کتنے پرندوں کے گھونسلے تھے اور اب ہر چند میٹر کی سڑک کے لیے ایک درخت کاٹا جا رہا ہے یوں ایک کلومیٹر پختہ سڑک کتنے ہی درختوں کے خون پر تعمیر ہوئی اور نجانے کتنے پرندوں کو بے گھر ہونا پڑا۔ بقول مجید امجد:

گھنے سہانے، چھائوں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

یہ وہ احساس ہے جو انتظار حسین کو فطرت سے پیار سکھاتا ہے۔ وہ جب بھی ہندوستان گئے ماضی کے آئینے میں جھانک کر فطرت کے کسی عنصر کو عصرِ حاضر میں موجود پا کر مسرور ہوئے۔"میری یادوں میں کتنی یادیں ایسی ہیں جن کا کسی شخص سے کسی تاریخی عمارت سے کسی ادبی محفل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس کسی پرندے کی اڑتی سی جھلک یا دور آتی اس کی آواز اور نگ آباد(انڈیا) کی ساری باتیں بھول گیا بس اس نگر کی کوئیلیں یاد رہ گئی ہیں۔"(۳)

انتظار حسین کے ہاں فطرت اپنے تاریخی و تہذیبی پسِ منظر کے ساتھ جلوہ افروز دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً کٹھ بڑھیا کا بیان ہو گا تو ہمیں سلیمان علیہ السلام اور ملکہ صباء بلقیس کے دور میں لے جائیں گے۔ کبوتر اور کوا نوح علیہ السلام کی طرف مراجعت پر مجبور کرتے ہیں۔ انہیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب سے لگائو ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے فرمانروا بھی عناصرِ فطرت سے محبت کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کو جب جلا وطن کیا گیا تو ان کے محلوں سے پورے پورے چڑیا گھر برآمد ہوئے، جنہیں حکمرانوں کے ساتھ دیس نکالا دیا گیا۔

بادشاہ (واجد علی) کی کوشش تھی کہ چرند پرند میں سے جتنی قسم کے جانور دستیاب ہو سکیں سب جمع کر لیے جائیں اور واقعی ایسامکمل اور زندہ عجائب خانہ شاید روئے زمین پر کہیں موجود نہ ہو گا۔۔ کبوتوں کا انتظام دیگر جانوروں سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیوں میں سب ملا کے چوبیس پچیس ہزار کبوتر تھے(۴) اپنے ناول، افسانے، سفرنامے اور کالم تک میں ان خوبصورت چیزوں کا ذکر تسلسل کے ساتھ کرتے رہے جو مل کر فطرت بنتے ہیں اور جو تہذیب کو متشکل کرتے ہیں انسان تو اشرف المخلوقات ہے اور باقی مخلوق کو اگر انسان سے علیحدہ کریں تو ترقی یافتہ تو شاید انسان بن جاے مگر فطرت کی نگاہ میں وہ اپنی زمین کو اپنے ہی اوپر تنگ کئے جا رہا ہے جو کہ ایک المیہ ہے۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے تھے اس لیے کوئی بھی بات ہو فطرت کے عناصر کو ضرور شامل کرتے تھے۔ انتظار حسین کے کردار تہذیبی رچائو کا مکمل عکس ہوتے ہیں۔ چاند گہن میں ان کا ایک کردار سوچنا چاہتا ہے اور سوچنے کے لیے بھی وہ ایک پیڑ کا سہارا لیتا ہے۔

"آم کے درخت کے نیچے وہ ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لیٹ گیا۔ یہاں لیٹ کر اس نے پہلی مرتبہ واضح اندا زمیں سوچا کہ آخر یہ لوگ افسوس کرنے کی باتوں پر افسوس کیوں نہیں کرتے۔"(۵)

آم کا درخت اور واضح انداز میں سوچنا یہ دونوں دراصل علامتیں ہیں جو ہمیں ماضی کی طرف لے جاتی ہیں درخت، گیان دھیان یہ دعوتِ فکر ہے قارئین کے لیے پیپل کو آم سے بدل کر قاری کی توجہ صدیوں پرانے واقعہ سے جوڑ کر خود شعوری کی منزل پہ پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات اور جملوں سے خوابیدہ فکروں پر دستک کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ عام طور پر ہمیں یہ بتایا گیا کہ طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا کر یورپ پر حملہ کیا تا کہ واپسی کا راستہ بند ہو جائے اور واپسی کی کوئی امید بھی باقی نہ رہے اور تاریخی طور پر یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ مشرق میں بنو عباس نے جب حکومت سنبھالی تو بنو امیہ کے لیے واپسی کا سوچنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر ہمارا یہ تہذیبوں و تاریخوں کا شناور فنکار جو انسانوں کے باطن کا مطالعہ کر کے اپنی کہانی کو ترتیب دیتا ہے بس عبدالرحمن الداخل کے ایک چھوٹے سے عمل سے ایک پوری انسانی نفسیات کو عیاں کر دیتا ہے۔ اور عمل بھی وہ جو فطرت سے جڑا ہوا ہے:

"ویسے یار عبدالرحمن اول نے کھجور کا پیڑ بو کر اچھا نہیں کیا، طارق بن زیاد کے منصوبے پر پانی پھیر دیا، واپس کا راستہ پھر سے کھول دیا۔ ہر کھجور ایک سرنگ تھی کہ اس میں اترو اور اپنے صحرا میں جا نکلو۔ جہاں درختوں کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے۔"(۶(

انتظار حسین انگریزوں کی آمد کو ہندوستان کی بدنصیبی کی ابتدا مانتے ہیں کیونکہ پندرھویں صدی کا صنعتی انقلاب، جہانگیر کے دور میں ہندوستان میں داخل ہوتا ہے وہ انیسویں صدی میں مکمل طور پر اپنے پنجے گاڑ کر ہندوستان کی عظیم تہذیب کی جڑیں کاٹنا شروع کرتا ہے اور ۱۸۵۷ء تو گویا اس کا نقطہ انجام ہے۔ اسی واقعہ کو انتظار حسین عام ہندوستان کے توسط سے بربادی کا استعارہ کہلواتا ہے۔ ہندوستان کے آخری تاجدار کے دربار میں تہذیب پوری طرح جلوہ فگن ہے۔ وہ تہذیب جو فطرت کے جھولنے میں ہلکورے لے رہی تھی، خلیل احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"ہزاروں کی تعداد میں ہر روز پرندے بہادر شاہ کے دسترخوان سے فیض یاب ہوتے اور اپنے حصے کا رزق پاتے-- بہادر شاہ نے انواع و اقسام کے پرندوں اور جانوروں کا باقاعدہ چڑیا خانہ پال رکھا تھا-- بادشاہی بلبل ہزار بولیاں بولتی جنہیں سن کر سننے والے سبحان اللہ کہتے۔"(۷(

انتظار حسین کاکمال یہ ہے کہ ان کی کہانی اکہری نہیں ہوتی بلکہ اپنے اندر کئی پرتیں رکھتی ہے وہ کہتے ہیں کہانی اور عورت میں اس وقت کشش برقرار رہتی ہے جب تک وہ کچھ دکھائے اور کچھ چھپائے یعنی مکمل طور پر آشکار نہ ہو یا دوسرے لفظوں میں قاری پر آسانی سے اپنے معانی ظاہر نہ کرے۔ وہ عناصرِ فطرت کا بیان مختلف پیرائوں میں کرتے ہیں بعض مرتبہ وہ کئی دوسرے اجسام کو انسانی سطح پر لا کر ایک عجیب سماں باندھ دیتے ہیں چاند گہن ان کا مشہور ناول ہے جس میں ہندوستانی عوام عجیب مخمصے اور خوف و تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں کیونکہ چاند گہن ہندوستانی سماج میں نحوست اور مصائب کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے وہ چاند کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں کہ عام ہندوستانی کی توہم پرستی قاری کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اس پوری کہانی میں چاند کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

"سنسان بیابان فضا میں زرد رو اکیلا چاند رینگ رہا تھا۔ خوف و ہراس کی ایک مبہم پر اسرار کیفیت چاندنی کی نس نس میں رچی ہوئی تھی--- چاند پر ایک کرب کی کیفیت طاری تھی--- بلند و بالا عمارتیں، درخت، ٹیلے سب یوں چپ چاپ کھڑے تھے گویا کسی نامعلوم خوف کے اثر سے سکتہ میں آ گئے ہیں---

ناصر کاظمی نے جو کہا تھا۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

انتظار حسین بھی بتاتے ہیں کہ جب انسان کسی مصیبت میں ہو کوئی غم اس کو لاحق ہو تو فطرت کے دوسرے ارکان بھی اس صورت حال سے لا تعلق نہیں رہ سکتے بلکہ وہ بھی انسانوں کے غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں وہ بے جان اور مادی اشیا ء کو بھی اپنے کردار بنا لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ گلی، کوچے، مکان وغیرہ کو کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ چراغوں کا دھواں 'جو کہ ان کی آپ بیتی ہے اس میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

"بستیوں کو جذبات سے عاری مت جانو۔ روٹھتی ہیں تو ایسا روٹھتی ہیں کہ نہ منائے منتی ہیں نہ درشن دیتی ہیں۔ "(۸)

وہ فن پر چونکہ قدرت رکھتے ہیں اس لیے کہانی بنتے ہوئے انہیں کسی قسم کی مشکل درپیش نہیں آتی۔ کرشن چندر کے بعد غالباً اکیلا انتظار حسین ہے جو معمولی بات پر بھی کہانی ترتیب دے دیتا ہے۔ راقم الحروف کا محدود مطالعہ ہے اردو فکشن میں "کالو بھنگی"کے بعد اگر کوئی پر تاثیر افسانہ (بظاہر کم اہم موضوع پر) ہے تو وہ "اجنہاری کی گھریا"ہے۔

انتظار حسین نے فطرت کے ایک کیڑے کو سامنے رکھ کر انجینئرنگ سے لیکر ادب تک کی بنت کے اصول سکھانے کی کوشش کی ہے جس طرح انسان مختلف جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے مختلف زمانوں میں مختلف ہنر سیکھتا چلا آیا ہے اس طرح کم از کم اردو ادب میں انتظار حسین کی یہ کہانی ایک عظیم سبق اپنے اندر رکھتی ہے کہ کسی طرح چکنی اور گیلی مٹی سے ایک بظاہر معمولی کیڑا ایک مضبوط گھر کو خود اندر رہ کر تعمیر کرتا ہے۔ انتظار حسین نہ صرف خود فطرت کا عاشق ہے اور اس کو فنی طور پر برتتا بھی ہے بلکہ وہ تو ان سے پیار بھی کرتا ہے جو فطرت کے کسی گوشے کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ مثلاً حفیظ جالندھری صاحب سے نظریاتی اختلاف کے باوجود ان کو پسند بھی کرتے ہیں:

"میں نے شاعر اسلام کا یہ نثری شاہکار پڑا، چیونٹی نامہ یعنی ایک "مہذب و متمدن مخلوق"کی داستانِ حیات اور حفیظ صاحب کی عظمت کے آگے سر جھکا دیا۔"(۹)

ہندوستان اتنی خوبصورت سرزمین ہے کہ یہاں جو بھی آیا وہ اس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر مبہوت ہوا۔ ابنِ بطوطہ سے واسکوڈے گاما اور البیرونی سے گستائولی بان تک نے یہاں کی تہذیب کے ساتھ ساتھ یہاں کی فطری خوبصورتی کا ذکر بھی کیا۔ آریوں سے سکندرِ اعظم اور تاتاریوں سے

انگریزوں تک جو بھی یہاں آیا یہاں کے حسن و شادابی ان کے پائوں کی زنجیریں بنتے رہے پھر یہی حسن تھا جس کے بارے میں ایک انگریز نے لکھا:

"کیا ہمیں چِت لیٹ کراملی کے پیڑ کی شاخوں پر جھنڈ کی صورت میں چمکتے ہوئے جگنوئوں کو دیکھتے رہنا چاہیے، جو اپنی ہزاروں جگمگاہٹوں سے املی کے اس پیڑ کو کسی دیو قامت کرسمس ٹری کی طرح روشن کر رہے ہیں۔"(۱۰(

یہ وہ فطرت کی رنگا رنگی ہے جس کا سحر انتظار حسین کو اپنے اندر جکڑ ے رہا۔ انتظار حسین جہاں بھی گئے اپنے اس ورثے کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہ کر پائے۔ ہجرت نے ان کو اپنی بستی چھوڑنے پر تو مجبور کر دیا مگر اسی غم و رنج کو انہوں نے ہتھیار بنا کر پورے برِ صغیر ہندو پاک کو اپنی بستی بنا کر ایک رزمیہ لکھی جو آنے والے زمانوں میں ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اور جب بھی فطرت کی بات ہو گی انتظار حسین لازمی زیرِ بحث آئیں گے۔

"دنیائے مغرب کے چند شہر دیکھ لیے، جی بھر گیا، دل کو وہی چٹک لگی ہوئی کہ کسی طور ایسے سفر کی صورت نکلیے کہ اپنی چھوڑی ہوئی انہیں گرد آلود بستیوں میں گھوم پھر کر دیکھیں کہ وہ ٹیڑھے میڑھے رستے، وہ انگلیوں جیسی گلیاں کس حال میں ہیں۔ املیوں کا اب کیا نقشہ ہے۔ گھنے چھدرے نیم، پیپل، برگد اپنے آڑھے ترچھے انداز میں کیا کہانی سناتے ہیں۔"(۱۱(

اس سائنس و ٹیکنالوجی نے جہاں نسلِ جدید کو اپنے گردو پیش سے بے خبر رکھا ہے، جہاں نئی نسل کو ماضی سے روشناس کرانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ اس فنکار نے ہندوستانی تہذیب کے خال و خد فطرت کے آئینے میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے اور یہ ماضی کی عظمت ہمارے سامنے آشکار کر کے ہم پر احسان کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی وطن، مٹی اور فطرت کا مصور تھا ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پھول کی ریکھائیں اس نے دیکھ کر
کھینچ دی تصویر میری ہو بہو
لمس اس کی یاد کا اور اس کے بعد
میرے اندر مشک وبو ہی مشک و بو
عکس اندر عکس آئوں میں نظر
تو اگر آ جائے میرے رو برو

انتظار حسین نے فطرت کے عناصر سے ماضی کی مکمل تصویر ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔

انتظار حسین کی مناظرِ فطرت خصوصاً درخت و پرندے سے وابستگی ایک تو اس لیے تھی کہ فطرتاً فنکار کو ان چیزوں سے لگائو ہوتا ہے اس کے علاوہ ہندوستان کی سر زمین کا حسن و خوبصورتی دراصل انہیں چیزوں سے مزین تھی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہند کے قدیم مذاہب میں ان عناصر کی حیثیت مسلم ہے مثلاً پیپل اور برگد وشنو کو عزیز تھے ولوا جس کو بیل بھی کہا جاتا ہے کی نسبت شیو سے ہے۔ نیم، تلسی، املی وغیرہ کی بھی پوجا کی جاتی تھی(جیسے قدیم عربوں میں

انجیر اور زیتون مقدس تھے، کچھ مسلمان آج بھی اسی حیثیت سے ان کو جانتے ہیں)۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق کے بقول:

"جب کوئی پودا مر جاتا ہے تو اسے دریا میں اسی احترام کے ساتھ بہا دیتے ہیں جس احترام کے ساتھ مورتی کو اس کی پوجا ختم ہونے کے بعد بہا دیتے ہیں۔ "(۱۲(

انہوں نے انتون چیخوف کے ایک ناول کا ترجمہ (گھاس کے میدانونمیں) کیا تو پیش لفظ میں یہ عقدہ بھی کھول دیا کہ آخر اسی ناول کا ترجمہ کیوں منتخب کیا گیا۔ پتہ چلا کہ فطرت کے عناصر کی صحیح منظر کشی اس میں موجود ہے اور یہ بھی اعتراف کیا کہ مجھ پر موسموں، درختوں اور پرندوں کے بہت احسانات ہیں۔ فطرت کا شناور ہی احسان مندی کابوجھ سہار سکتا ہے۔ ان کے ہاں ان عناصر کی محبت کے رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان نے جب ایٹمی دھماکے (Nuclear Test)راجھستان میں کیے تو وہاں کے مور تابکاری سے مر گئے اس پر حساس دل فنکار نے پہلے تو کالم لکھا پھر ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ مادی و صنعتی ترقی نے جہاں فطرت کو آزار پہنچائے وہیں انسانی اقدار بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ صدیوں پرانی روایات کا خاتمہ اور خاص طور پر انسانی رویوں کی تبدیلی جس میں وہ اشرف المخلوقات کے منصب سے گر کر اسفل السافلین کی منزل پر جا پہنچا۔ انتظار حسین سمجھتے تھے کہ درخت پرندے، موسم کسی سے نفرت نہیں کرتے۔ دشمن کے لیے بھی اتنا ہی سایہ فراہم کرتے ہیں جتنا دوست کے لیے۔ کوئل کی کوک اور بلبل کا نغمہ بھی بلا تفریق سب کے لیے ہوتا ہے۔ جنگل کو انہوں نے اصل میں تہذیب کا مسکن سمجھا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"دیر تک خیالوں میں کھویا رہا پھر ایک پچھتاوے کے ساتھ کہنے لگا، کاش میں نے نیپال کے جنگلوں میں ہجرت کی ہوتی۔"(۱۳(

ہر بڑا فنکار حساس ہوتا ہے اور فطرت کی بوقلمونیاں اور نیرنگیاں اس کو لبھاتی ہیں اور خصوصی طور پر بڑے فنکاروں کے کائنات کا حسن ہمیشہ کشش کا باعث رہا ہے اور وہ ان فطرت کے عناصر سے محبت کرتا آتا ہے۔ ہیمنگوے کے بارے میں اعجاز راہی نے لکھا ہے:

"اس نے سائنس اور فن میں دلچسپی لینا اپنے گھر سے سیکھا۔ فطرت سے محبت کا درس اپنے اوک پارک کے دیہاتوں، درختوں، جھیلوں اور جنگلوں سے ملا۔"(۱۴(

ادب میں فطرت نگاری کی روایت بہت مضبوط ہے اور اس کو درجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش انتظار حسین کے ہاں ہمیں ملتی ہے۔ انتظار حسین نے ناصر کاظمی کا آخری انٹرویو (برائے پی ٹی وی) ہسپتال میں کیا تھا۔ ایک سوال انتظار نے کہا تھا کہ ناصر آپکو وہ درخت اور چڑیاں یاد آتی ہیں۔ ناصر نے جواب دیا تھا کہ ہاں اور جا کر میرا ان چڑیوں کو سلام کہنا۔ انتظار حسین نے فطرت کے ان حسین کرداروں پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کے بیان کے لیے دفتر درکار ہیں اور کئی ناقدین نے اس بات پر ٹوکا بھی کہ یہ کیا ہر بات میں آپ درختوں اور پرندوں کو بیچ میں لے آتے ہیں۔ قصہ کہانیوں کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"یار مجھ پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ تجھے اور کوئی غم نہیں ہے درختوں کے کٹنے کا نوحہ کرتا رہتا ہے۔ اب اس کی سمجھ آ جانی چاہیے جنگل کہانی کار کی آخری پناہ گاہ ہے۔"(۱۵(

اور یہی حقیت ہے نہ صرف کہانی کار بلکہ ہر حساس دل اور مہذب انسان کے لیے شایدشہروں میں رہنا مستقبل میں مشکل ہو گا۔ مگر المیہ یہ بھی کم تر نہیں کہ جنگل سلامت رہیں گے تو کوئی ان کو پناہ گاہ بنائے گا نا۔ اپنے ناول آگے سمندرہے میں لکھتے ہیں

"اس دھرتی پر سب سے بڑا ماجرا تو درخت ہے۔ دیکھنے میں جھاڑ جھنکار، کوئی معمولی بات نظر نہیں آتی بس کھڑے ہیں۔ مگر کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کوئی درخت ماجرا بن جائے۔" (۱۶(

حوالہ جات:

)۱(برٹنڈر رسل، فلسفہ مغرب کی تاریخ(ترجمہ پروفیسر محمد بشیر)، پورب اکادمی(طبع اول)، اسلام آباد، ۲۰۰۲، ص ۸۳۸

)۲(انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱

)۳(انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، (طبع دوم)، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱۰

)۴(آل احمد سرور، ہمارا ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۵

)۵ (انتظار حسین، چاند گہن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۷

)۶(انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۲

)۷(خلیل احمد صدیقی، لال قلعہ کا آخری تاجدار، مکتبہ القریش، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۴، ۷۵

)۸ (انتظار حسین، چاند گہن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۵۰، 51

)۹(انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، (طبع دوم)، ۱۹۹۹ء، ص ۶۹، ۴۶۸

)۱۰ (انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، (طبع دوم)، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۰

)۱۱(بیورے نکولس، برطانوی ہند کا مستقبل، (ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فرقان) مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷، ص ۸

)۱۲ (انتظار حسین، جستجو کیا ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۱۵۵

)۱۳(مہر عبدالحق، ہندو صنمیات، بیکن بکس (طبع دوم)ملتان، ۲۰۰۲ء، ص۴۳۳

)۱۴(انتظار حسین، شہرِ افسوس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۵

)۱۵(اعجاز راہی، نوبیل انعام یافتہ ادیب، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ص ۱۷۲

)۱۶(انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶

/....../